Rizwan Ullah
D-178, Abul Fazl Enclave-I
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Tel: 9971283786, 9891832189
Email:ruilmi@rediffmail.com
Web: www.Rizwanullah.com

کتب صحافت کی بازدید

رضوان اللہ

مانچسٹر میں ''دی امیگرنٹ'' کے زیرِ اہتمام حال ہی میں ایک علمی اور ادبی ورکشاپ منعقد ہوئی جس کی مختصر روداد ہفت روزہ ''عالمی سہارا' کے شمارہ مورخہ ۱۳؍جون ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اس ورکشاپ میں کتابوں کی تصنیف کے اصولوں پر روشنی ڈالی گئی۔ مصنف اور تخلیق کار کی اہمیت پر بھی گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر سارے مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی حلقوں کی نمائندگی ہوئی۔ اور مشاہیر ادب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایک خاص نکتے پر میری نظر جم گئی۔ اس کی عبارت یہ تھی ''کتاب دراصل خیالات و جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ جس ماحول میں انسان بستا ہے اس میں رونما ہونے والے ہر واقعہ کو اپنے اندر نقش کرنے کے بعد اسے کاغذ پر تحریر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی تخلیق اس کی کتاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔''

بس میں اسی جگہ ٹھہر گیا اور اپنی تصنیف ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' کے مشمولات کو اپنی فکر کی روشنی میں دیکھنے لگا پھر مذکورہ بالا بیان کی صداقت کی روشنی میں اس کو پرکھنے لگا۔ دراصل یہ سب کچھ میں اس کتاب میں لکھ چکا ہوں۔ وہ ایک سوزِ دروں کا اظہار و بیان ہے۔ پہلے کوئی ربع صدی تک ایک الاؤ میں تپتا رہا اور مضطرب رہا۔ اس کے بعد کوئی ربع صدی تک ان بھیانک تجربات کو اپنے وجود میں سمو کر مختلف طریقوں سے اظہارِ مدعا کی مشق کرتا رہا تب کہیں جا کر کسی کتاب کی شکل میں اظہار کی قدرت و جسارت اور اس کی اشاعت کا حوصلہ پیدا ہوا۔

جب اس کام سے فارغ ہوا تو ہر طرف نظر دوڑانے لگا کہ اس لپٹ نے کسی اور صاحبِ دل حقیقت شناس اور حق گو کے دامن کو بھی شعلہ سامانی عطا کی ہے یا نہیں۔ یہ ایک طویل بحث ہے، صحافت کے بحر ناپیدا کنار میں غواصی ہے لیکن اپنے فن سے عشق اور اعتماد و یقین آتش نمرود میں بھی جست لگانے پر مہمیز کرتے ہیں، چنانچہ میری تصنیف ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' وجود میں آئی۔ جہاں تک اس تصنیف کے مقصد کا تعلق ہے اس کا اندازہ تو صاحبِ نظر کو کتاب کھولتے ہی انتساب کی عبارت سے ہو جائے گا۔ ''ان گمنام صحافیوں کے نام جن کا خونِ جگر شاہ سرخیوں کے کام آیا۔'' اس سے پہلے اردو صحافت کے موضوعات پر کتابیں کم لیکن خوب خوب لکھی گئیں مثلاً مولانا امداد صابری کی ''اردو صحافت کی تاریخ'' لیکن ان تصنیفات سے ان روح فرسا حالات کا اندازہ نہیں ہوتا جن سے آزادیِ وطن کے

بعد مظلوم و مقہور زبان اردو کی صحافت سے چمٹے ہوئے حرماں نصیب صحافی گزر رہے تھے۔ میری تصنیف کا مقصد انہی کی جانسپاریوں کو ضبطِ تحریر میں لا کر اپنی صحافت کی تاریخ میں محفوظ کرنا تھا سو میں نے شاید اپنے حصے کا کام کر دیا۔ یہ نہ اردو صحافت کی گزشتہ تاریخ ہے نہ سارے ہندوستان کی کہانی۔ اس میں صرف کلکتہ کے ایک منظر پر فوکس کیا گیا ہے جسے پوری صورتِ حال کا اشاریہ کہا جا سکتا ہے۔ اس تصنیف کے آگے پیچھے، آس پاس، اردو صحافت کے مختلف پہلوؤں پر متعدد تصنیفات ملک کے مختلف خطوں میں منظرِ عام پر آئی ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ یہ سلسلہ جاری ہے۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی سے اردو صحافت کے ہم کنار ہونے کے بعد اس میں جو ترقیاں ہوئیں اور اسرار و رموز کے جو انکشافات ہوئے ان پر نئی تصنیفات میں خوب خوب لکھا گیا ہے، امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

بہر حال جب میں نے دائیں بائیں ہم سفروں پر نظر دوڑائی تو صرف ایک مردِ مجاہد آتش زیر پا نظر آیا پروانہ رودولوی۔ جس تپش نے آزادی کے بعد اردو صحافت کی آزمائشوں اور اردو صحافیوں کی جانسپاریوں کا رزمیہ لکھنے پر مجبور کیا اور ایک تصنیف کی شکل میں میرا سوزِ دروں متشکل ہوا وہ پروانہ رودولوی کی تصنیف ''اردو صحافت کا استغاثہ'' میں شعلہ جوالہ نظر آتا ہے۔ میں نے زبان و بیان کے استعمال میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے لیکن وہ بالکل شمشیرِ برہنہ نظر آتی ہیں۔ اردو صحافیوں کے ساتھ مالکوں خصوصاً مسلمان مالکوں کی بدسلوکی اور ساتھیوں کی منافقت کے درد کی وجہ سے میری سسکیاں ان کے یہاں چیخ کی طرح سنائی دیتی ہیں۔ مثالیں پیش کرنے میں میں نے قدرے احتیاط سے کام لیا ہے لیکن پروانہ صاحب نے ہر احتیاط کو طاق پر رکھ دیا ہے۔ ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ کلکتہ میں اردو صحافت کا کینوس قدرے محدود تھا اور تنوعات بھی نہیں تھے لیکن پروانہ صاحب کے لیے دہلی کا کینوس بہت وسیع اور رنگا رنگ تھا۔

اردو ادب کے ٹھیکے داروں کی طرف سے صحافیوں کی کم وقعتی پر میرے یہاں حرفِ شکایت دبا دبا ہے لیکن پروانہ صاحب بجا طور پر بالکل چراغ پا ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ''ہر دور میں اعلیٰ پایہ کے ادیب اخبارات سے وابستہ رہے ہیں.....اردو صحافت نے اردو زبان کو فروغ دے کر ادبی زبان بنانے کے سلسلے میں جو خدمت انجام دی ہے اس سے لاکھ چشم پوشی کی جائے مگر جب کوئی بھی اردو زبان کے فروغ کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ سب سے پہلے اردو صحافت ہی کا ذکر کرے گا جس نے نثری ادب کا باقاعدہ آغاز کیا اور اردو شاعری کو بند کمروں اور نجی محفلوں سے عوام تک پہنچا کر اس کو مقبول بنایا۔'' وہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی تصنیف ''صحافت پاکستان اور ہند میں'' سے یہ اقتباس پیش کرتے ہیں: ''صحافت کا مقصد صرف یہ نہیں رہا کہ قارئین تک خبریں پہنچائے اور انھیں اس کے پس منظر سے آگاہ کرے۔ صحافت کا ایک بڑا مقصد یہ بھی رہا ہے کہ وہ لوگوں میں علم کو فروغ دے۔''

اردو صحافیوں کی اعلیٰ صلاحیتوں کی ستائش کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔'' پروانہ رودولوی بھی ان کے بے حد مداح اور ان کی صلاحیتوں کے معترف ہیں، ان کی حوصلہ افزائی کے مشورے دیتے ہیں اور انھیں اردو کا سچا محافظ قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو صحافت سے چشم پوشی کرنا بڑی بددیانتی قرار پائے گی۔ صحافت بغاوت کی زبان ہے۔ میرے خیال سے صحافت بغاوت کی زبان ہو یا نہ ہو لیکن تنقید

اوراحتجاج کی زبان ضرور ہے۔

کچھ اردو صحافت ہی پر منحصر نہیں دنیا بھر کی صحافتوں کا بڑی حد تک ترجمہ پر انحصار ہوا کرتا ہے کیونکہ اس کے بغیر دنیا بھر کی زبانوں کے درمیان لین دین ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ اردو صحافت میں مترجموں کی ناقدری پر پروانہ صاحب بہت برہم ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ جب ظفیر الحسن صاحب اس فن کی اہمیت بیان کرتے ہیں تو اس سے انھیں اتفاق نہیں ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو پروفیسر فضل الحق نے ''اردو ماس میڈیا'' کے زیرِ عنوان جو کتاب مرتب کی وہ صحافت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مبسوط مضامین پر مشتمل ہے اس میں پہلا مضمون سید ظفیر الحسن کا ہے ''ترجمہ- ایک فن''۔ اس مبسوط مضمون میں ظفیر صاحب نے فن ترجمہ کے مختلف پہلوؤں پر خوب خوب بحث کی ہے جس کا اندازہ اس مضمون کے ذیلی عنوانات سے کیا جاسکتا ہے۔ ''زبانوں کا آپسی رشتہ، زبان: تاریخ اور تہذیب کی ترجمان''، ترجمہ: معلومات کے ابلاغ و ترسیل کا اہم وسیلہ، اخباری اور کتابی زبان، بارے انگلش کا کچھ بیان ہوجائے، نثری اور منظوم ترجمہ''۔ ظفیر صاحب کی ساری نکتہ رسی کے باوجود پروانہ صاحب اخباری ترجمہ کے سحر میں ایسے مبتلا ہیں کہ اس سے باہر آنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر فضل الحق کی کتاب میں اس مضمون کا حوالہ تو دیا ہے لیکن ترجمہ کی پرخار وادی کے معترف نہیں ہیں، حالانکہ ظفیر صاحب نے ترجمہ کی بعض مشکل رہگزاروں کا تذکرہ نہیں کیا ہے جیسے کہ عدالتی کارروائیوں کا ترجمہ، سفارت کاری میں، جو کہ اقوام کے باہمی تعلقات کا اہم ترین وسیلہ ہے، ترجمہ کی ناگزیریت اور ترجمہ اور ترجمانی کا فرق وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب کی مرتب کردہ کتاب میں پانچ اصحاب کے نو مضامین شامل ہیں۔ مناسب ہوتا کہ ان حضرات کا مختصر تعارف بھی کتاب میں شامل کردیا جاتا۔ میں اس وقت ظفیر صاحب کا بہت مختصر تذکرہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ میرے عزیز ترین دوست اور رفیق کار تھے میں نے اپنی کتاب ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' میں تفصیل کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے۔

کلکتہ کے روزنامہ ''عصرِ جدید'' میں ظفیر الحسن صاحب میرے ساتھ کام کرچکے تھے۔ میں اس اخبار میں ۱۹۵۱ء سے کام کررہا تھا۔ ظفیر صاحب ۱۹۵۴ء میں پٹنہ سے آکر شریک ہوئے، جلد ہی روزنامہ ''آزاد ہند'' میں چلے گئے۔ وہاں سے ایک جست میں حکومت مغربی بنگال کے اردو جریدہ ''مغربی بنگال'' کے ایڈیٹر ہوگئے۔ دوسری جست میں مرکزی حکومت کی وزارتِ اطلاعات سے وابستہ ہوکر اردو کمنٹری رائٹر کے طور پر ممبئی میں مامور ہوئے وہاں سے ایک اور جست میں وزارتِ دفاع میں پہنچ گئے اور جنوبی کمانڈ کے ہیڈکوارٹر واقع پونا میں پی آر او ہوگئے پھر اپنے اور یجنل خول یعنی وزارتِ اطلاعات میں دہلی آکر ڈی اے وی پی کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہوئے، پھر ایک قدم آگے بڑھ کر پلاننگ کمیشن کے جریدے ''یوجنا'' کے چیف ایڈیٹر ہوئے۔ اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے لیکن اس کے بعد حکومت جموں و کشمیر نے انھیں سرینگر میں ڈائریکٹر آف انفارمیشن کا عہدہ پیش کیا وہاں تین سال کی ماموری کے بعد دہلی واپس آکر یہیں وفات پائی۔ میرے اور ظفیر صاحب کے درمیان گہرے تعلقات تھے لیکن وہ جو مہم جوئی پر نکلنے تو ۱۸ برس تک ہم لوگوں کی ملاقات نہیں ہوئی مگر اس مدت دراز کے بعد ہم لوگ جب دہلی میں ملے تو معلوم ہی نہیں ہوا کہ اٹھارہ برس کی مدت مدید کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ وہی سابقہ بے تکلفیاں حسبِ معمول جاری رہیں۔

آزادی کے بعد اردو صحافت جن آزمائشوں سے گزری ان کا میں نے اپنی کتاب میں قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے ان پر پروانہ صاحب کی بھی نظر ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اردو کے صحافیوں کو آزادی سے قبل جن حوصلہ شکن، سخت اور اذیت ناک مرحلوں سے گزرنا پڑا آزادی کے بعد ان سے بھی برے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔'' اس پر مستزاد میں نے ایک بڑی نازک سی صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دراصل میں کلکتہ کے پس منظر میں گفتگو کر رہا تھا جہاں ٹریڈ یونین تحریک زیادہ فعال تھی لیکن وہیں ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز ہونے کی وجہ سے صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی تنظیمیں بھی زیادہ فعال تھیں۔'' گویا دونوں طرف کی تنظیمیں اپنے اپنے وابستگان کی رہنمائی کے لیے پوری طرح آمادہ اور سرگرم تھیں ایسے میں گنے چنے اردو روزناموں کے مالکان کے لیے یہ بات طبعی تھی کہ (پریس کمیشن کی رپورٹ کے بعد پیدا شدہ حالات و معاملات میں) وہ بڑے بڑے اخباری مالکان سے رجوع کرتے اور نئے حالات میں ان سے قانونی رہنمائی حاصل کرتے۔ گویا وہ صنعتی تقسیم اردو اخباروں میں بھی کارفرما ہوئی لیکن اردو صحافت اور دیگر صحافتوں کے درمیان ایک خاص فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ اردو صحافت میں مالک اور ملازم دونوں ہی مظلوم اور حالات کے جبر کا شکار تھے اور ایک کمزور طبقے کے افراد کے طور پر جو مار پڑی ان کو جھیلنے والے دونوں ہی تھے۔''

سید عاشور کاظمی کی تصنیف ''بیسویں صدی کے اردو اخبارات و رسائل مغربی دنیا میں'' سے موازنہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ کتاب ۲۰۰۲ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں برطانیہ، سوئیڈن، ناروے، جرمنی، کناڈا، ڈنمارک اور امریکہ سے شائع ہونے والے ۱۱۹ اخباروں کا ذکر ہے، ان میں سے بیشتر ماہنامے یا ہفتہ وار ہیں، روزنامے صرف تین لندن سے شائع ہونے والے جنگ، ملت اور اردو ٹائمز ہیں۔ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے، برصغیر ہندو پاک کی اردو صحافت کے متعلق اس سے پہلے اور اس کے بعد شائع ہونے والی متعدد کتابوں کے خواص اس میں شامل ہیں گو اس کا فوکس مغربی دنیا میں شائع ہونے والے اردو اخبارات و جرائد پر ہے۔ بعض موازنوں سے اس کا اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی ذہنی فضا وہی ہے جو ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' کی ہے۔ اس کا اندازہ ان دونوں کتابوں کو کھولتے ہی ان میں درج انتساب کی عبارت سے ہی ہوسکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' کا مصنف حالات کی تپش میں جھلسا ہوا صحافی اپنے ہمسفروں کے کرب میں شریک ہے، دوسرا دور نزدیک سے مشاہدہ کرنے والا، مبتلائے آزار صحافیوں سے ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے۔

ایک اور موازنہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کلکتہ میں اردو صحافیوں کی کیفیت اور ان کی حیثیت کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے کم و بیش وہی کیفیت کراچی کے اخبار نویسوں کی تھی۔ تنخواہیں تقریباً ستر روپیہ ماہانہ سے شروع ہوکر ایک سو پچاس روپیہ ماہانہ کے نقطۂ عروج تک، اس پر سے مالکانہ رعونت کا سامنا۔ اسی ذہنی کیفیت کے ساتھ یہ سارا منظر جب برطانیہ منتقل ہوتا ہے تو بدلے ہوئے خارجی حالات میں ویسی ہی کھینچ تان، کاتبوں کی تحریک وغیرہ وغیرہ۔ مصنف نے اس کتاب کے تصنیفی نظام میں مولانا امداد صابری کی تصنیف ''اردو صحافت کی تاریخ'' کو سامنے رکھا ہے۔ اگر اس کتاب کو ایڈٹ کر کے قاعدے سے اس کی اشاعت نو کی جائے تو افادیت اور بڑھ جائے گی۔ اس میں ہندوستانی

اخبارات کی فہرست کے ساتھ ساتھ قابلِ ذکر صحافیوں کے تذکرے اور ان کی تحریروں کے نمونے شامل ہیں۔

ان ضمنی مشابہتوں کے باوجود ''اردو اخبارات ورسائل مغربی دنیا میں'' ایک بالکل مختلف اور اہم کتاب ہے جو مغربی دنیا میں اردو صحافت کی رسائی کی صرف خبر ہی نہیں دے رہی ہے بلکہ مکمل وقوف فراہم کرتے ہوئے مستقبل کی بشارتیں بھی دے رہی ہے۔ میڈیسن یونیورسٹی میں ڈاکٹر عمر میمن کی کاوشیں بڑی حوصلہ افزا اور ہمارے اس شدید احساس کی ترجمان ہیں کہ اردو زبان کے ادبی سرمائے کو یوروپین زبانوں میں پیش کرنا ضروری ہے تاکہ ادب کی عالمی منڈی میں اس بحرِ ناپیدا کنار میں پوشیدہ گہر ہائے آبدار کی پرکھ ہو سکے۔ کناڈا اور امریکہ میں اردو ادب وصحافت کی رسائی اور سمائی کے اسباب اور کوائف بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ کس طرح پنجاب کے کھیت مزدور وہاں کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی فصلیں اگا سکتے ہیں تو ذہنوں کی آبیاری کا سامان فراہم کرنے کا موجب بھی بن سکتے ہیں۔

''اردو ماس میڈیا'' ۱۹۹۳ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ پروفیسر فضل الحق اس کے مرتب ہیں۔ اردو صحافت کی دنیا میں گوناگوں تجربات اور مہارتوں کی حامل پانچ شخصیات کے تحریر کیے ہوئے نو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ 'ترجمہ ایک فن' (سید ظفیر الحسن) جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے 'اسپیشل فیچر' اور 'انٹرویو اور پریس کانفرنس (کمال احمد صدیقی) 'اداریہ نویسی' (عشرت علی صدیقی)، 'ایجنسی رپورٹنگ' اور 'اشتہارات اور رابطہ عامہ' (شافع قدوائی)، 'کتاب کیا ہے'، 'مسودہ کیسے تیار کریں' اور 'پروف کی جانچ' (قیصر شمیم)۔

ایک جید صحافی اور مشہور وممتاز اخبار قومی آواز کے سابق ایڈیٹر عشرت علی صدیقی نے اپنے مضمون ''اداریہ نویسی'' میں موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن مجھے ایک بات کھٹکتی رہی۔ صدیقی صاحب نے ایڈیٹر کے اندر ایک بہت بڑی خوبی یا صلاحیت کا ذکر نہیں کیا۔ میرے خیال سے ''بصیرت'' ایک ایسی خوبی ہے جس کا حامل ہونا کسی ایڈیٹر کو واقعی رہنما بناتا ہے۔ بصیرت وہ خاصیت ہے جس کی بنا پر کوئی شخص مستقبل میں دور تک دیکھ سکتا ہے، آنے والے واقعات کا اندازہ کر سکتا ہے پھر اپنی اسی چھٹی اور غیر معمولی حس کی روشنی میں قارئین کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ صرف زبان پر قادر ہونا، موثر پیرایۂ اظہار کا حامل ہونا یقیناً ایڈیٹر کے اندر ضروری صفات میں سے ہیں لیکن اگر بصیرت نہ ہو تو کسی اہم موقع پر کسی اہم مسئلہ پر اپنے قارئین کی صحیح رہنمائی کس طرح کر سکتا ہے؟

''ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل وابلاغ کی زبان'' ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کی یہ تصنیف ۱۹۹۸ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ کتاب کے مشمولات کے عنوانوں سے اس کی وسعت اور حدود کا اندازہ ہو جائے گا: ''ہندوستان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی مختصر تاریخ، اردو کا ارتقا، ترسیل کی زبان کی حیثیت سے، زبان تقریر سے تحریر تک، اردو نشریات کی زبان کا تجزیہ، اردو خبروں کی زبان کا تجزیہ، ریڈیو اور دوردرشن کے پروگراموں میں اردو کا حصہ، اہم اردو پروگراموں کے مسودے اور ریکارڈ۔

یہ کتاب بڑی حد تک ہندوستان میں ریڈیو نشریات کا احاطہ کرتی ہے۔ جہاں تک ٹی وی نشریات کا تعلق ہے اسے پچھلی صدی کے آخری عشرہ میں ابتدائی دور ہی کہنا چاہیے کیونکہ اس کے بعد کے دو عشروں میں ٹیکنالوجی کی

ترقیاں اپنے ساتھ ساتھ زبان کو بھی آسمان کی بلندیوں کی طرف لیے جارہی ہیں۔ تاہم ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے نشریاتی زبان کے فن کو جن بلندیوں تک پہنچادیا ہے وہ بلاشبہ نشانِ راہ ہیں۔ انھوں نے ریڈیو نشریات کے حوالے سے بعض ادبی شہ پاروں کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ بذاتِ خود ایک چاشنی رکھتے ہیں اور ماضی کی دلآویز ادبی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔

''ابلاغیات'' ڈاکٹر شاہد حسین کی تصنیف ہے۔ جس کے تین ایڈیشن دہلی سے شائع ہوچکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۲۰۰۴ء میں دوسرا ۲۰۰۶ء میں اور تیسرا ۲۰۰۸ء میں۔ اس کتاب کو فن صحافت یا درس صحافت کا نصاب کہا جاسکتا ہے۔ یہ مطبوعہ اور اب تک کی نشری صحافت کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ ترسیل و صحافت کی تعریف سے لے کر اس کی مرحلہ وار ترقیوں اور ہندوستان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ارتقائی مرحلوں سے شناسا کرتی ہے۔ ۲۰۰۸ء تک ہندوستانی ٹیلی ویژن بحیثیت مجموعی تقریباً عالمی ترقیوں کے ہمدوش ہو چکا تھا اور اس عمل میں ان کے اردو نشریات بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے لیکن جیسا کہ ہر علم میں ہوتا ہے کوئی واحد کتاب اس علم کے سارے پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتی۔ کئی کتابیں مل کر اس ضرورت کی تکمیل کرتی ہیں چنانچہ ہندوستانی صحافت کی تاریخ، اخباروں اور صحافتی تحریروں کے حوالے دوسری متعلق کتابوں میں ملتے ہیں جہاں تک فن صحافت کا تعلق ہے ڈاکٹر شاہد حسین کی یہ تصنیف ایک مکمل نصاب ہے۔

''اردو صحافت ترجمہ و ادارت'' سید ضیاء اللہ کی یہ تصنیف ۱۹۹۴ء میں بنگلور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مشمولات: صحافتی زبان، لفظ و معنی کی صحت، محاورہ، روزمرہ، جملوں کی ساخت، رموز و اوقاف، ترجمہ، ادارت، اداریہ نویسی، سرخیاں، پروف ریڈنگ، صفحوں کی تزئیں۔ ان مضامین کے علاوہ آخر میں ضمیمے بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ جانوروں کی آواز، چند محاورے اور ان کے مطالب، غلط لکھے جانے والے الفاظ، املا نامہ کی سفارشات، مذکر و مؤنث الفاظ، واحد الفاظ اور ان کی جمعیں، ہندسوں کے نام، اردو میں مستعمل عربی لفظ اور ان کی جمعیں، آخر میں کتابیات میں شامل فہرست کتب سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد لغات، فرہنگ اور قاموس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

صحافت خواہ مطبوعہ ہو یا نشریاتی زبان کی صحت تو پہلی شرط ہے لیکن یہ شرط ایسی ہے کہ صحافت سے متعلق کتابوں میں اس پر اصرار کم نظر آتا ہے۔ ایک بات اور ہے وہ یہ کہ شمالی ہند کی صحافت میں شاید یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا''، جنوبی ہند میں کئی زبانوں کے خلط ملط ہوجانے کی وجہ سے شاید اس استناد پر شک ہو اس لیے سید ضیاء اللہ صاحب نے زبان کی اصلاح کی ضرورت پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے بعد مطبوعہ صحافت کے دیگر پہلوؤں پر حسبِ ضرورت روشنی ڈالی ہے، نشریاتی صحافت سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے، لیکن زبان کی اصلاح کی بنیادی ضرورت تو وہاں سب سے زیادہ ہے۔ یوں اب شمالی ہند کی صحافت کے کسی بھی پہلو کو دیکھئے تو زبان کی کیفیت ایسی ابتر ہوتی جارہی ہے کہ سند کا درجہ تو بہت دور کی بات ہے، قدم قدم پر اس کی درستگی ہی مشکوک ہوتی ہے۔

ہمارے وسیع و عریض ملک کے ہر خطے اور علاقے سے اردو اخبارات شائع ہوتے رہے ہیں اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ صرف سمجھنے سمجھانے کی غرض سے میں انھیں علاقائی اخبارات کہہ رہا ہوں۔ زبان کی بقا اور سارے ملک

کو یکجہتی کی سلک میں پروئے رکھنے میں ان کی بڑی اہمیت اور بڑا اہم رول ہے۔ اسی طرح شمال، جنوب، مشرق، مغرب کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والی اردو صحافت سے متعلق تصنیفات کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ انھیں کسی شکل میں اکٹھا کر دیا جائے تو بہت سارے تنوعات یکجا ہو جائیں گے مثلاً کسی کتاب میں صرف اخبارات کی فہرست سازی اور تاریخ اشاعت ہے کسی میں صرف مطبوعہ صحافت سے سروکار ہے، کسی کتاب میں نشریاتی یا الیکٹرانی صحافت کے اسرار و رموز ہیں، کہیں صحافت کے مختلف فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، کہیں زبان و بیان سے بحث ہے۔ غرض کہ اب تک اتنا کچھ لکھا اور شائع کیا جا چکا ہے کہ وہ آئندہ صحافیوں اور اس علم کے طالب علموں کی مکمل رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ علاقائی صحافت سے متعلق تصنیفات سے بھی کہیں کہیں حیران کن معلومات حاصل ہوتی ہیں، مثال کے طور پر طیب انصاری کی تصنیف ''حیدرآباد میں اردو صحافت'' صرف حیدرآباد کے اخبارات کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ بھی ۱۸۵۹ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک لیکن اس سے تہذیبی منظر نامہ اور سیاسی اتار چڑھاؤ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی کتاب سے منکشف ہوا کہ ''مشیر دکن'' کشن راؤ نے ۱۸۹۲ء میں جاری کیا تھا جس کی اشاعت خواہ کسی حال میں سہی اب تک جاری ہے۔

''بازیافت'' (۲۰۰۵ء)، ''میڈیا روپ اور بہروپ'' (۲۰۰۶ء)، ''مغربی میڈیا اور اسلام'' (۲۰۰۸ء)، ''میڈیا، اردو اور جدید رجحانات'' (۲۰۱۰)، یہ تصنیفات سہیل انجم کی ہیں۔ گونا گوں صحافتی مصروفیات کے باوجود ان کی تصنیفی کاوشیں بھی جاری ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ان کتابوں کے نام ہی سے ان کا تنوعات ظاہر ہے۔

'بازیافت' صرف صحافت سے متعلق تصنیف نہیں ہے بلکہ اردو زبان اور اردو صحافت سے متعلق مضامین کے علاوہ دیگر مضامین اور شخصیات سے متعلق مضامین اس تصنیف میں شامل ہیں۔ اس کا اندازہ چند عنوانات سے ہو جائے گا: اردو کے مسائل اور ہم، نوجوان نسل اور اردو، اردو صحافت کے مسائل، اس کے بعد چند شعراء اور شخصیات کے تذکرے ہیں جو واقعی بازدید کا لطف دیتے ہیں۔ جو مضمون ''اردو صحافت کے مسائل'' کے زیرِ عنوان لکھا گیا ہے اس میں سہیل انجم نے ان سارے مسائل کی فہرست بندی کر دی ہے جو اس فن، پیشہ اور صنعت کو درپیش ہیں جن پر الگ الگ بہتیری کتابیں موجود ہیں اور خود سہیل انجم اپنی اگلی تصنیفات میں ان مسائل سے الگ الگ نبرد آزما ہیں۔

ان کی اگلی تصنیف ''میڈیا اور بہروپ'' ہے، جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اسی وجہ سے اس کو بہروپ کہا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں تین جید صحافیوں (سعید سہروردی، محفوظ الرحمٰن اور موہن چراغی) کے مضامین ہیں، اس کے بعد جو کچھ ہے اس کا اندازہ چند مضامین کے عنوانات سے ہو سکتا ہے: میڈیا اور ہمارا معاشرہ، نیشنل میڈیا اور مسلم مسائل، میڈیا کا منفی رویہ، میڈیا اور خوف کی نفسیات، قومی پریس اور فرقہ واریت، گجرات فسادات میں میڈیا کا رول۔ اس کے بعد الیکٹرانک میڈیا کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً: الیکٹرانک میڈیا کی رسائی، نیوز چینلوں کے اسٹنگ آپریشن، ایس ایم ایس ایک انوکھا ذریعہ ترسیل، اس کے بعد آنے والے مضامین میں اردو صحافت سے متعلق امور پر گفتگو کی گئی ہے۔ اردو پریس اور جذباتیت، اردو صحافت کے مسائل پر طائرانہ نظر، قصۂ درد سناتے ہیں۔ یہی وہ درد ہے جس کی

تپش میں میں جھلسا، پروانہ رودولوی آتش بہ جاں نظر آتے ہیں۔ ہماری ہی طرح سہیل انجم بھی اردو صحافیوں کی ناقدری اور انھیں اور ان کی صحافت کو کمتر سمجھے جانے پر دل برداشتہ ہیں، لیکن ان صحافیوں کے درد کا مداوا دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اس سلسلے میں آخری مضمون ''اردو کی اہم قابل ذکر ویب سائٹس'' اس کتاب کو منفرد بناتا ہے۔ یہ دلدادگان اردو اور اردو صحافت کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔ اس مضمون کے لیے سہیل انجم نے یقیناً بڑی کاوش اور فلک پیمائی کی ہے اس کے لیے وہ قابلِ مبارک باد ہیں۔

''مغربی میڈیا اور اسلام'' سہیل انجم کے اس سفر میں تیسرا پڑاؤ ہے۔ اس کتاب میں پہلے تین مضامین پروفیسر اختر الواسع، ابن احمد نقوی اور ڈاکٹر رضوان احمد کے ہیں اس کے بعد سہیل انجم کا دفتر کھلتا ہے۔ اس میں کیا کچھ ہے کتاب کے عنوان سے ہی ظاہر ہے۔ تینوں ابتدائی مضامین اور بقیہ ساری کتاب ایک ہی موضوع کے لیے وقف ہیں لیکن ان کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ چند عنوانات سے کیا جاسکتا ہے: میڈیا، مغرب اور مسلمان، مغرب اور اسلام، میڈیا اور اسلاموفوبیا، دہشت گردی کے معاملے میں دوہرا معیار، امریکی میڈیا اور مسلمان، برطانوی میڈیا کی مسلم کوریج، تہذیبوں کا ٹکراؤ اور میڈیا کا رول، میڈیا رپورٹنگ اور مسلم ردِعمل، امریکہ میں اسلام کا خاموش انقلاب۔

ظاہر ہے سہیل انجم کی اس تصنیف میں وہی کچھ ہے جو ایک عرصہ سے ہم میڈیا میں پڑھتے، دیکھتے اور سنتے آئے ہیں لیکن سہیل انجم نے دستاویزی حوالوں کے ذریعہ مغرب کی اسلام دشمنی کو ایک سند کی حیثیت دے دی ہے تاہم اس اسلام دشمنی کے باوجود اسلام کے مذہبی اور معاشرتی پہلوؤں کے متعلق مغرب میں جو تجسس پیدا ہوا ہے وہ مغرب کی عقلیت پسندی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور نتیجہ بھی سامنے ہے یعنی اعداد و شمار مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافے کی گواہی دے رہے ہیں۔ ساری مخالفتوں کے اندھیرے میں یہ روشنی کی کرن ہے۔ سہیل انجم کی اس رائے سے ہمیشہ میرا یہ خیال ہم آہنگ رہا ہے کہ اس پوری صورت حال میں ہماری کوتاہیوں کو بھی دخل ہے۔ ہم نے میڈیا میں معقولیت پسند حلقوں کی نہ تو بخوبی نشاندہی کی ہے نہ ان سے ربط ضبط بڑھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مخالف میڈیا کے طوفان میں ہم اپنا دیا نہیں جلا سکتے تو تھوڑے سے معقولیت پسندوں سے ربط ضبط بڑھانا بہترین متبادل ہے۔

''میڈیا، اردو اور جدید رجحانات'' یہ سہیل انجم کی اگلی تصنیف ہے۔ یہ دو ابتدائی مضامین کے علاوہ تین ابواب پر مشتمل ہے: میڈیا، ایک صورت ہزار جلوے، میڈیا اور اردو، میڈیا اور مسلم معاملات۔ ان تین ابواب میں ۲۷ مضامین ہیں، ابتدائی دو مضامین میں سے پہلا مضمون پروفیسر شافع قدوائی کا ہے۔ دوسرا مضمون میرا ہے جس کا عنوان ہے: ''اردو صحافت کا منظر نامہ''۔ جی تو چاہتا ہے کہ سہیل انجم کی اس کتاب کے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے اسی مضمون کو نقل کر دوں لیکن خوفِ طوالت مانع ہے، اس لیے کچھ اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔

میڈیا ایک بحرِ بیکراں ہے، جس کی حدیں ہر روز نہیں، ہر لمحہ وسعت پذیر ہیں۔ سہیل انجم اس بحرِ ناپیدا کنار کے شناور ہی نہیں، ایسے غواص ہیں جو وقفے وقفے سے معلومات کے گہر ہائے آبدار لے کر نمودار ہوتے ہیں۔

ان کی اس تصنیف کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں اور عصری میڈیا کے رشتوں کو سمجھنا سمجھانا ہے۔ اس

تصنیف کی معنویت اوراس کے مضمرات اسی اجمال کی تفصیلات ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے ہم اس کو تین ابواب میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول ہم عصر میڈیا، دوم اردو یا مسلم صحافت، تیسرے الیکٹرانک میڈیا۔ جہاں تک ہم عصر میڈیا کا تعلق ہے اس میں زبانوں کی کثرت، نظریات کے اختلافات اور تنوعات اور مسلمانوں کے تئیں ان کے مختلف اور متضاد رویوں کی وجہ سے ان کا مختصر تجزیہ بھی خاصا مشکل اور عام قاری کو الجھانے والا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس تصنیف میں شامل کئی مضامین مثلاً ہم عصر میڈیا اور رجحانات، قومی میڈیا اور مسلمان، دہشت گردی، مسلمان اور میڈیا اور اس سلسلے کے دیگر مضامین کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔ فی الحال اشارتاً کہا جاسکتا ہے کہ سہیل انجم نے مختلف اخبارات و نشریات کے حوالے سے اور متعدد مستند اور معتبر صحافیوں کے انٹرویوز کے ذریعہ ان غلط فہمیوں کو اجاگر کیا ہے جو ہم عصر میڈیا میں مسلمانوں کے تئیں موجود ہیں۔ مثلاً دہشت گردی کے تئیں عام مسلمانوں کا نرم رویہ یا اردو صحافت، بہ الفاظ دیگر مسلم صحافت کا محض احتجاجی ہو کر رہ جانا۔ سہیل انجم نے ان اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

انٹرویوز سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اعتدال پسند صحافی میڈیا کے ہر شعبہ میں موجود ہیں وہ مسلمانوں کے مسائل اور حقیقتِ حال کو جاننے کے خواہشمند بھی ہیں لیکن انھیں نہیں معلوم کہ وہ یہ کام کیسے کریں۔ انھیں بہر حال مسند نشینوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ اتنی ہی بات اس ضرورت پر زور دینے کے لیے کافی ہے کہ مخلص صحافی سامنے آئیں عصری میڈیا میں کھلے ذہن کے لوگوں کو تلاش کر کے ان سے مستقل رابطے میں رہیں اور ان کے تجسس کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہیں۔ یہ وقتی نہیں مستقل اور مسلسل عمل ہے۔

سہیل انجم نے مدارس سے شائع ہونے والے جرائد کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں بڑی کاوش کی ہے۔ ان کی آمدنی کے محدود وسائل کی طرف اشارے کیے ہیں اور انھیں اپنی اشاعتوں کو زیادہ بہتر اور مفید بنانے اور آمدنی کے وسائل دریافت کرنے کے ضمن میں مفید مشورے دیے ہیں، اس کے ساتھ ہی ان رسالوں کی ذہنی آبیاری کرنے والوں کے معاشی حالات بہتر بنانے کی ضرورت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان رسائل کی رسائی دور دور تک ہے اور عوامی ذہن پر ان کی گرفت بھی مضبوط ہے، اس لیے میڈیا کی پیدا کی ہوئی اور پھیلائی ہوئی بہت ساری خرابیوں کی اصلاح کا یہ بہترین ذریعہ ہیں، اس بیش بہا اور مؤثر وسیلے کو بھرپور استعمال کیا جانا چاہیے۔

ایک اور سوال اکثر کیا جاتا رہا ہے کہ اردو صحافت کس کی ہے؟ اس کا صاف اور سیدھا جواب تو یہی ہے کہ جو اس صحافت کا قاری، سامع، ناظر یا مخاطب ہے یہ صحافت اسی کی ہے۔ لیکن اس سوال کی رمزیت بڑی تکلیف دہ ہے کیونکہ قومیت یا زبان کی مذاہب کے خانوں میں تقسیم کا تصور تکلیف دہ اور ناقابلِ قبول ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے انقلاب نے اردو کے مال متاع کو ہر جامے میں فٹ کرنے کے ناممکن عمل کو ممکن بنا دیا لیکن اس بظاہر عمل مساوات نے اردو زبان وادب اور صحافت کی داخلی کشاکش کو کم کرنے کے بجائے بڑھا دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی بہی خواہان اردو کی تشویش میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اس کی تفصیلات اور اس صورتِ حال کے مقابلے اور اصلاح کی کوششوں کی طرف سہیل انجم کی موجودہ تصنیف میں اشارے موجود ہیں، اس سلسلے میں زبانی جمع خرچ کے بجائے مسلسل پرخلوص

اورصدق دلانہ عمل کی ضرورت ہے۔ابھی بلاتکلف کہہ دینا چاہیے کہ اس کا بارصحافیوں اوراردواساتذہ کو ہی اٹھانا چاہیے۔اگرانھوں نے ایسانہیں کیاتو یہ کارِخیر جسے بہرحال ہونا ہے قدرت ان کے ہاتھوں سے لے کرکسی اورکوسونپ دے گی اوروہ اس سعادت سے محروم رہ جائیں گے۔ایسا ہوبھی چکا ہے۔آج وہ سنگین حقیقت ہمارے سامنے ہے۔

اردو پریس کے پس منظر میں جب ترجمہ کی بات ہوتی ہے تو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ گویا یہ اخبارات صرف ترجمہ کے مرہونِ منت ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں خبر رسانی کا عمل روزِ اول سے ترجمہ کی معرفت ہوتا رہا ہے۔اس حقیقت کو بیان کرنے کی ضرورت اردوصحافت کے دفاع میں پیش آئی ہے۔لیکن آج ہندوستان میں اردو زبان کواسی ترجمہ سے نئے خطرے لاحق ہیں۔قصہ یہ ہے کہ اردو کی حیثیت سے ہزارانکار کے باوجود یہ وہ جادو ہے، جو ہندی کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔چنانچہ میڈیا ہوفلم یاابلاغِ عامہ کا کوئی شعبہ وہاں ہندی زبان کا استعمال کرنے والے اپنی زبان کی زیبائش کے لیے اردو سے کچھ پرلے کراپنی کلغی میں الٹے سیدھے کی تمیز کیے بغیر ٹھونس لیتے ہیں اور ''مخالفت'' کو''خلافت''، ''تفصیل'' کو''خلاصہ'' کہنے لگتے ہیں۔مثالیں اوربھی ہیں۔ یہ ہماری زبان کی خطرناک تخریب ہے اوراس کا تشویشناک پہلو یہ ہے کہ اردووالے اپنی بےعملی یا کام چوری کی بنا پران بگڑی ہوئی شکلوں کو ہی اختیار کرتے جارہے ہیں۔یعنی ہندی سے اردو میں ترجمہ نہیں کرتے صرف رسم الخط بدل دیتے ہیں۔اس باب میں اردومیڈیا کے اربابِ اقتدار کوسخت گرفت اورسخت رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

''اردوصحافت کا سفر'' (۲۰۰۷ء) نئی دہلی: گربچن چندن کی یہ تصنیف ۱۹/مضامین پر مشتمل ہے اور پونے چارسوصفحات پر محیط ہے۔کتاب کا ٹائٹل ہی اس امر کا غماز ہے کہ اردوصحافت کا سفر، ترقی کی طرف جاری ہے۔ یہ کتاب معلومات کا خزانہ تو ہے ہی خاص بات یہ ہے کہ بہت ساری معلومات دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں جوشواہد کے حوالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ یہ کام چندن صاحب ہی کے بس کا تھا۔حکومت ہند کے انفارمیشن بیورو میں ۳۲ برس تک خدمات نے انھیں جوموقع فراہم کیا تھا وہ دوسروں کونصیب نہ تھا پھر یہ کہ چندن صاحب نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اورنہایت مخلصانہ کاوش کے ذریعہ بیش بہا اورنایاب معلومات کوقارئین تک پہنچایا۔

ایسی ہی ایک مثال کلکتہ میں ملتی ہے۔شانتی رنجن بھٹا چاریہ حکومت مغربی بنگال کے شعبہ اطلاعات سے وابستہ تھے، انھوں نے مولانا آزاد کے پاسپورٹ کے بارے میں خفیہ اطلاعات کی فائل کونیشنل آرکائیوز میں دیکھا اوراس کومنظرِ عام پرلائے۔ یہ غیرمعمولی موقع ہرکسی کونصیب نہ تھا۔انھوں نے''بنگال میں اردوصحافت کی تاریخ'' بھی رقم کی۔ بعد میں مغربی بنگال اردواکادیمی نے رئیس احمد جعفری کی نظرثانی اورقدرے اضافے کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت ثانی کی اس طرح گزشتہ صدی کے آخری عشروں میں کلکتہ کے کارکن صحافیوں کے کچھ احوال بھی اس میں شامل ہوگئے۔

چندن صاحب کی کتاب کے ابتدائی دومضامین میں سے ایک عبدالباری مسعود کا ہے اوردوسرا مضمون ڈاکٹر عقیل احمد کا ہے جو ۳۰-۳۲ صحافت پر مشتمل ہے۔اس مبسوط مضمون کوایک طرح کتاب کا خلاصہ کہنا چاہیے۔ یہ مضمون قاری کومہمیز کرتا ہے کہ وہ جہاں سے چاہے تفصیلات کو پڑھ لے۔اس کتاب کو دوحصوں میں منقسم سمجھنا

چاہیے۔ پہلا حصہ ''چراغ جلے اجالا'' کے زیرِ عنوان آزادی سے پہلے تک کی اردو صحافت کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ذیل میں چند عنوانات سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ برصغیر میں مطبوعہ اردو صحافت کی ابتدا۔ پہلے پریس ایکٹ کا محرک 'جام جہاں نما' تھا، اردو صحافت ۱۹۴۰ء میں، تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ، اردو صحافت اور قومی یکجہتی۔

دوسرے حصے کا عنوان ''نیا سویرا'' ہے۔ اس کے تحت چند مضامین کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں: عصری اردو صحافت اور مسائل، ہندوستان میں اردو صحافت، اردو صحافت اکیسویں صدی کے اوائل میں، اردو صحافی آج کیا کرے، آخر الذکر موضوع کے تحت اردو صحافیوں کے لیے کچھ اشارے کیے گئے ہیں۔ اس سے زیادہ ممکن بھی نہیں تھا۔ اس ضمن میں چندن صاحب نے سرسید احمد خاں، مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور حسرت موہانی کی اور ان کی صحافتی کاوشوں کی مثالیں پیش کی ہیں، لیکن آج اردو اور اردو صحافت کو خصوصاً مسلم صحافت کو جو مسائل درپیش ہیں وہ محولہ بالا سارے حالات سے مختلف ہیں۔ پہلے دور میں حکومت کی مشنری اردو زبان اور صحافت کے تئیں غیر متعصب اور غیر جانبدار تھی اب ایسا نہیں ہے۔ شرارت پسند اور تخریبی عناصر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے جرائم کا ارتکاب کر کے بے خوف گھومتے ہیں، ان کا مقابلہ کرنا قلم کاروں کے بس کی بات نہیں، اس طرح بالکل بدلے ہوئے حالات میں نئی بصیرتوں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک اردو صحافت کے مستقبل کا تعلق ہے چندن صاحب نے جن اندیشوں کا اظہار کیا ہے وہ بالکل بجا ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی تصنیف منفرد ہے۔

ایک اور ایسی کیفیت ہے جو مصنف اور تصنیف دونوں کو سب سے مختلف اور منفرد بناتی ہے وہ یہ کہ چندن صاحب کو آزادی سے پہلے اردو صحافت کے ایک بڑے مرکز لاہور کے کوائف کو دیکھنے کا موقع ملا تھا، اس کے بعد دہلی کی صحافتی جولانگاہ میں عمر گزاری۔ یہ موقع نہ مولانا امداد صابری کو نہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو نہ کسی اور کو حاصل ہوا۔

آخری بات جو میری اس تحریر کی محرک ہوئی اور اس مضمون کے آغاز میں ہی بیان کی گئی ہے وہ ہے آزادی کے بعد اردو صحافیوں کی ابتلا و آزمائش جس کی تپش سے میں سلگتا رہا اور پروانہ صاحب سرتاپا شعلہ صفت رہے۔ اس کی طرف بھی چندن صاحب نے صرف اشارے کیے ہیں، سرکاری مشنری کے ایک پرزے کی حیثیت میں اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ پریس کمیشن کی سفارش کے مطابق جو اجرتی بورڈ بنا تھا اس کی ایک ذیلی کمیٹی اردو پریس کے متعلق تھی، جس کے سربراہ ڈاکٹر محمد علیم صاحب تھے وہ کمیٹی کلکتہ بھی گئی تھی، اس کے ایک رکن عابد علی خاں صاحب، ایڈیٹر روزنامہ سیاست، حیدرآباد نے صرف ایک دو مالک ایڈیٹروں سے ملاقات کی کسی اردو ورکنگ جرنلسٹ سے مل کر یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس پر کیا گزر رہی ہے، اس کو بھی کچھ کہنا ہے یا نہیں۔

میں نے اپنی کتاب کے آخر میں ایک انڈکس دیا ہے جس میں وہ سارے نام شامل ہیں جن کا کتاب میں ذکر آیا ہے۔ اس طرح ایک حوالے کے طور پر اس کتاب کی افادیت بڑھ جاتی ہے جو اور کسی کتاب میں نظر نہیں آتی۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ کلکتہ اردو پریس کا قاری دوسرے علاقوں سے کسی قدر مختلف تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی ہند کے بہت سے لوگ ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے تھے اور یہ کوئی وقتی عمل نہ تھا بلکہ آمد و رفت کا ایک سلسلہ تھا جو رک رک کر جاری رہتا تھا۔ آزادی کے پندرہ بیس سال بعد تک اس پورے خطے میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے

رہے۔اس لیے وہ مستقلاً مضطرب اور پریشان رہتے، انھیں معلوم ہی نہ تھا کہ ان کے مسائل کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے ایسے میں اخبارات ان کی رہنمائی کے لیے کیا کرتے۔ بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد اس طرف اردو واخبارات بند ہو گئے۔ہم لوگوں نے سنا تھا کہ کلکتہ کے کچھ اخبارات اس طرف بھی چلے جاتے ہیں لیکن ظاہر ہے اس طرف کے پڑھنے والوں کی رہنمائی کا کوئی سامان ان اخباروں میں نہیں ہوسکتا تھا۔اگر کچھ ممکن تھا تو صرف دونوں طرف امن وآشتی کی تمنا۔گویا کلکتہ اردو پریس کے قاری کی ایک تعداد غیر مستحکم تھی مزید یہ کہ بنگلہ بولنے والے مسلمانوں کے مسائل ومعاملات کو بنگلہ پریس ایڈریس نہیں کرتا تھا۔ یہ فریضہ بھی اردو اخباروں کو ہی نبھانا تھا چنانچہ کلکتہ اردو پریس کے قاری نے اس کو غیر معمولی حالات سے دوچار کر رکھا تھا اور وہ ان حالات سے جس طرح نمٹ رہا تھا اس کا تذکرہ کہیں نہیں تھا۔ میں نے اپنی تصنیف میں اس کو بیان کیا۔مزید یہ کہ ۱۹۷۵ء کی ایمرجنسی کے دوران ملک بھر کے صحافیوں کو جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا اس میں کلکتہ کے اردو صحافی پہلے دوبار مبتلا ہو چکے تھے۔ایک ۱۹۶۲ء کی ہند-چین جنگ کے دوران دوسرے ۱۹۶۵ء میں ہند-پاک جنگ کے دوران۔ان تجربات نے کلکتہ اردو پریس کے ذمہ داروں کو زیادہ محتاط بنا دیا تھا۔

موضوع کے اعتبار سے یہ مضمون بالکل ناکافی ہے اور صرف اشارے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن کچھ نہ کرنے سے کچھ کرتے رہنا بہتر ہے۔